OPEN ACCESS
Al-Nasr
ISSN (Online): 2958-9398
ISSN (Print): 2959-1015
https://alnasrjournal.com

زبان کے معیار کے تعین کی ضرورت واہمیت اور میڈیا کا کردار

The Necessity and Importance of Establishing Language Standards and the Role of Media

Dr. Abdul Sattar Malik

Lecturer, Department of Urdu, AIOU, Islamabad

Dr. Abdul Jabbar

Pak Secretariat, Islamabad

Abstract

Debates in setting benchmarks for a specific language have great significance which covers the areas like pronunciation, accent, tone and idioms etc. As Urdu is national language of Pakistan. It is need of the hour to establish certain parameters and may be incorporated in different spheres of life to create uniformity in oral as well as in written communication like diction and orthography. In this way a standard may be evolved in textbooks, electronic media and print media. In this article, researcher discusses the issues in Pakistan perspective and proposes certain recommendations to fix the problem.

Key Words: Standardization of Language, Role of Media, Pronunciation, Accent

اُردو ملخص

زبان کے معیار میں تلفظ، لہجہ، روزمرہ محاورہ اور سند کے مباحث بنیادی ہیں۔ اب جبکہ اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اسے دفتری زبان بنانے کے لیے کوششیں جاری ہیں، اس لیے لازم ہے کہ اُردو زبان کے لیے ایک معیار متعین کیا جائے اور زندگی کے ہر شعبے میں اس معیار اور مخصوص لب ولہجہ کو سامنے رکھا جائے۔ بولنے کے ساتھ تحریر واملا میں بھی ایک معیار اور مقتدر

CC BY

نمونہ بھی اہم ہے تا کہ نصابی کتابوں اور برقی میڈیا و اخبارات میں بھی ایک معیار بر قرار رہے۔ اس مضمون میں اس بنیادی مسئلے کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے پاکستانی تناظر میں اُردو کے لیے ایک ٹکسال کا تعین کرنے کے لیے اہم پہلوئوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ

زبان کا معیار، ٹکسال، سند، میڈیا، لب ولہجہ

زبان کی وسعت کے ساتھ اُس کی صحت کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ حسنِ بیان اور حسنِ زبان کے لیے معیار کا تعین ضروری ہے۔ معیاری زبان کا تصور دنیا کی ہر زبان میں پایا جاتا ہے اور ہر مہذب اور متمدن معاشرے میں زبان کی ایک معیاری بولی ہوتی ہے، جو دوسری فروعی اور تحتی بولیوں کے لیے معیار اور سند کا درجہ رکھتی ہے۔ معیاری زبان میں اہلِ زبان کے شائستہ اسلوب، ٹکسال اور لب ولہجہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ زبان کے معیار میں تلفظ، لہجہ، روزمرہ، محاورہ اور سند کے مباحث بنیادی ہیں۔ تلفظ کی صحت اور معیار کے لیے زبان کے مزاج اور لہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ چونکہ مختلف علاقائی زبانوں کے لسانی عادات، آب وہوا اور تہذیب ومعاشرت کے زیر اثر لہجے و تلفظ میں اختلاف لازمی اَمر ہے، اِس لیے زبان کی درست سمت میں اصلاح وترقی کی خاطر ایک ٹکسالی اور معیاری زبان کا تعین ضروری ہے، تا کہ لفظ کی صحت وعدم صحت اور فصاحت وعدم فصاحت کی جانچ پرکھ کے لیے اِس کو سند مانا جاسکے۔ تاریخ میں اِس کی اہم مثال جامع القرآن حضرت عثمانؓ کا وہ عمل ہے، جس میں انھوں نے اپنی مملکت کے مختلف علاقوں اور قبیلوں کی زبانوں اور لہجوں کو منسوخ کرکے قرآنِ پاک کا ایک نسخہ لغتِ قریش میں مرتب کرایا اور قریش کا لہجہ ہی قرآن کی قرأت کے لیے سند ٹھہرا۔ بقول ڈاکٹر نصیر احمد خان:

> زبان اصولوں کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔ جس میں ایک منطق اور تنظیم پائی جاتی ہے۔ جب زبان اپنی منطقی ترتیب سے ہٹ جاتی ہے تو غیر معیاری کہلاتی ہے۔ معیاری زبان میں جو چیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ زبان کا اپنی قواعد اور ساخت کے اعتبار سے صحیح استعمال ہے۔ یعنی تلفظ اور زبان کے اجزائے ترکیبی، الفاظ اور جملوں کا درست استعمال۔[1]

زبان کی ترقی اور عروج کے لیے ایک معیار کا تعین بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی معیار مقرر نہ کیا جائے تو کوئی زبان علمی وادبی او دفتری و تعلیمی زبان نہیں بن سکتی۔ حتیٰ کے اِس کی ساخت کی تشکیل ہی نہیں ہو سکتی اور صرف ونحو ہی وجود پذیر نہیں ہو سکتی، اِس لیے زبان کے قواعد، لغات، روزمرہ ومحاورات کا معیار قائم کرنا لازم ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے مطابق :

> اگر زبان کی صحت اور فصاحت کا کوئی معیار ہی نہ مقرر کیا جائے اور ہر جگہ کے مخصوص الفاظ ومحاورات کا استعمال جائز رکھا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مقام کے رہنے والے کی تحریر دوسرے مقام کے باشندے نہ سمجھ سکیں گے اور ایک مفہوم کے لیے بے ضرورت اتنے الفاظ ومحاورات زبان میں داخل ہو جائیں گے کہ اِن سب سے واقفیت اور اِن سب پر عبور حاصل کرنا کسی کے امکان میں نہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ بغیر کوئی معیار مقرر کیے ہوئے اُردو زبان سمجھنے والوں کا حلقہ وسیع نہ ہو سکے گا اور ملک کی مشترکہ زبان نہ بن سکے گی۔ اِن ہی وجوہ سے کسی مقام کو زبان کا مرکز قرار دینا بھی ضروری ہے۔[2]

ہر مہذب قوم اور ملک نے ایک شہر اور اِس میں بسنے والے ایک خاص طبقے کی زبان کو سامنے رکھ کر زبان کی فصاحت اور معیار کے قاعدے بنائے۔ جس طرح عرب میں قریشی لہجہ، ایران میں شیراز و تہران کی فارسی اور برطانیہ میں لندن کی انگریزی۔ اِسی طرح ماضی میں برصغیر میں دہلی کی اُردوئے معلی سند اور معیار رہی۔ تہران اور لندن تو اَب بھی معیاری زبان Standard Language کے لیے ٹکسال اور سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بادشاہت کے زمانے میں مقتدر طبقہ کی زبان ہی سند تھی اور کلام الملوک کو ملوک الکلام مانا جاتا تھا۔ یہاں یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ طبقۂ خاص سے مراد صرف دولت مند طبقہ نہیں بلکہ صاحبِ اقتدار طبقہ ہے، کیونکہ محض بنیے اور سیٹھوں کی زبان کو معیار کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ بادشاہت کے زمانے میں چونکہ دربار ثقافت کا مرکز ہوتا تھا اور علما و ادبا کے اثر اور صحبت سے ایک کمال زبان تشکیل پاتی تھی، وہ دربار کی زبان ہوتی تھی جو پورے ملک کے لیے سند کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لیے ماضی میں انگریزی کے لیے کنگز انگلش اور اُردو کے لیے اُردو معلی کی اصطلاح مستعمل رہی اور شاہی قلعے کی زبان اور دہلی شہر معیار اور ٹکسال رہے۔ جب دہلی اجڑا اور دہلی کے شعرا و ادبا اور مستند اہلِ زبان نے لکھنو کا رخ کیا تو وہی استناد و اختصاص جو دہلی کو حاصل تھا، لکھنو کو حاصل ہو گیا۔ لیکن اَب بساط اُلٹ چکی، نہ وہ دلی رہا، نہ لکھنؤ۔ ہندی کو قومی زبان کا درجہ ملنے کی وجہ سے ہندوستان میں اُردو کا وہ مقام نہ رہا، جو اِسے تقسیم برصغیر سے قبل حاصل تھا۔ اب نئی دنیا ہے اور اِس کے نئے تقاضے۔ اہلِ پاکستان کے لیے دلی اور لکھنو کا روزمرہ اور محاورہ فطری اور میراثی نہیں اکتسابی ہے۔ ایسے میں معیار پر وہ زبان مسند نشیں ہو گی جو ذریعہ تعلیم ہے، کیونکہ ہر زبان کی تعلیم اُس کے مرکزی محاورے میں دی جاتی ہے۔ بقول سلیم عبد اللہ :

> سب کی اُردو زبان، لہجہ اور طرزِ ادا میں فرق واختلاف ہے۔ اَب معیاری اُردو وہی ہے جس کے تحت صرف و نحو کے قواعد مرتب ہیں اور جس کے روزمرہ محاوروں پر اُردو کے انشا پرداز اور تعلیم یافتہ طبقہ کا عمل۔ ممکن ہے بدلے ہوئے حالات کے تحت آگے چل کر بعض باتوں میں ترمیم ہو اور اِس ترمیم کو تعلیم یافتہ طبقہ اور اعصابِ ذوق قبول کرلیں۔ مگر اِس وقت تو ہمیں وہی اُردو سکھانی ہے جسے اُردو کا تعلیم یافتہ طبقہ معیاری اُردو کہتا ہے اور جس کے مطابق درستی کتابیں رائج کی جاتی ہیں۔ [3]

ماضی میں دہلی کو ٹکسال سمجھا جاتا تھا اور سارے برصغیر کے لوگ دلی کے اہلِ زبان کے تلفظ اور لب ولہجہ کی پیروی کرتے تھے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد صورتِ حال مختلف ہے۔ پاکستان کے پانچوں صوبوں بشمول کشمیر میں علاقائی زبان کے زیر اثر اُردو کا اپنا مخصوص تلفظ اور لہجہ ہے۔ جہاں تک اہلِ زبان کا تعلق ہے، اُن کی اکثریت کراچی میں موجود ہے لیکن بھارت سے ہجرت کرنے والے مہاجرین بھی مختلف علاقوں سے آئے اور اُن کی گفتار میں اُن کے آبائی علاقوں کی بو باس شامل ہے۔ اِس لیے وہاں بھی ایک مثالی لہجہ مفقود ہے اور مہاجرین کا لہجہ پاکستان کی بقیہ آبادی کی نمائندگی نہیں کرتا۔ چونکہ زبان کے معاملے میں دارالحکومت ہی کو معیار اور ٹکسال گردانا جاتا ہے۔ اِس اصول کے تحت اسلام آباد ٹکسال قرار پاتا ہے لیکن اسلام آباد اس قدر کم عمر شہر ہے کہ اسے ایک معیاری اور ٹکسالی زبان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر ایک عرصہ درکار ہے۔ چنانچہ معیاری پاکستانی اُردو اَب ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعلق ہو گئی ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں، بی بی سی کا تلفظ انگریزی میں معیاری تلفظ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کے قیام سے اُردو زبان کے معیار اور لہجہ کو استناد اور مرکزیت حاصل ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان زبان، تلفظ اور لہجے کا معیار ٹھہرا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مقامی زبانوں کے اختلاط سے اُردو کا ایک نیا رنگ وروپ نکھرا جو ہندوستان کی اُردو سے متعدد پہلوئوں (ذخیرۂ الفاظ، تلفظ، لب ولہجہ، روزمرہ و محاورہ) میں مختلف ہے۔ دوسری طرف اُردو بیرونی ممالک میں بھی پھل پھول رہی ہے اور عالمی سطح پر اُردو تیسری بڑی زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ ایک نوعمر زبان کا بین الاقوامی طور پر یہ مقام حاصل کرلینا یقیناایک امتیاز ہے۔ الفاظ کا حسنِ انتخاب، تلفظ کی شائستگی اور لہجے کی گھلاوٹ ایک معیاری اُردو کے تقاضے ہیں اور ہر خطے کی نسبت سے اِس کا اپنا لہجہ اور سرمایۂ الفاظ تشکیل پذیر ہے۔ اِیسے میں ضروری ہے کہ معیاری تلفظ اور لب ولہجے کے لیے کوئی ٹکسال اور معیار قائم ہو جو سب کے لیے مثال اور سند بن سکے۔ جس طرح انگریزی ساری دنیا میں بولی جارہی ہے اور اِس کے مختلف لہجے، امریکی، کینیڈین، آسٹریلین اور برصغیر کی انگریزی ہیں، لیکن اِن سب کو معیار نہیں سمجھا جاتا۔ معیار صرف لندن اور اکسفورڈ کی انگریزی ہے اور اِس کا متعین تلفظ اور لہجہ (Accent) ہی ٹکسال اور پیمانہ ہے۔ زبان کوئی جامد شے نہیں۔ اِس میں افزائش ونمو اور تغیر و تبدل کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے اور اس کے ساتھ فصاحت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ میر و مرزا کی زبان کے بہت سے الفاظ اَب غیر فصیح ہو چکے ہیں۔ شیخ امام بخش ناسخ نے تعینِ معیار (Standardization) کے لیے متروکات کو چھانٹ کر زبان باہر کیا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ زمانے نے خود اُن کی فصاحت پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ وقت کے بہائو کے ساتھ الفاظ کا بدلنا، معنی ومفہوم کا کھو دینا اور روزمرہ اور محاورے کا تغیر ایک اَٹل حقیقت ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے میں معیار کا کیا پیمانہ اختیار کیا جائے گا۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ اِس معاملے میں یہ سفارشات پیش کرتے ہیں :

(الف)۔ روزمرہ محاورہ کی یکسانی سے زبان کی مرکزیت قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا فی الحال حتی الوسع اُردو کے مقرر محاورہ روزمرہ کے اکتساب واحترام کی کوشش کی جائے۔

(ب) معیاری تلفظ اور لب ولہجہ۔ دہلی اور لکھنؤ کے اس روزمرہ و محاورہ کو جو اساتذہ کی کتابوں میں موجود ہے اب بھی تسلیم کرنا چاہیے تا کہ زبان کا مرکزی سرمایہ خمیر منتشر نہ ہونے پائے۔

(ج)۔ لیکن اگر اُردو (مادری) علاقوں کا ہر شخص یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ سند ہے تو خدشہ یہ ہے کہ یہ دعویٰ اب نہیں چلے گا اور اس سے کچھ جھگڑے پیدا ہونے کا امکان ہے لہٰذا اس دعوے برتری کو اب ترک کرنا ہو گا۔

(د)۔ پاکستان کی حد تک ایک نیا روزمرہ کسی اصول کی بنا پر بنتا ہو تو اس پر ناراض نہیں ہونا چاہیے۔

(و)۔ لیکن یہاں بھی معاملہ وہی ہے کہ نیا روزمرہ تب مستند ہو گا جب فصحا اور مستند اساتذہ وادبا کے کلام میں آکر جذب ہو جائے گا اور اہل ذوق اسے قبول کرلیں گے۔

(ہ)۔ لیکن یہ جو کمیٹیاں بنا بنا کر کچھ لوگ نئی زبان اور نیا روزمرہ بنارہے ہیں یہ غیر فطری اور لغو کوشش ہے۔[4]

زبان کا معیار

زبان کے معیار کے ضمن میں اہل زبان کے تعین کے مباحث بھی جاری رہے اور ماہرین زبان وادب نے اپنی اپنی آرا پیش کیں۔ ڈاکٹر ابو سحر کے مطابق: اہل زبان سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے لیے اُردو مادری زبان یا بمنزلۂ مادری زبان کے ہے۔ یا جو اسے اپنے شوق کی پہلی یا دوسری زبان کی حیثیت سے سیکھتے ہیں یا سیکھنا چاہتے ہیں۔ اُردو کے مالک دراصل یہی لوگ ہیں۔ اِن کے خیالات، احساسات وجذبات کو نظر انداز کر کے اُردو کی بقا اور ترقی کا مشکل ہی سے کوئی تصور کیا جا سکتا ہے۔[5] ڈاکٹر سید عبد اللہ کی رائے میں: صحتِ زبان اور فصاحت ایک جوہر ہے لیکن جہاں مختلف عناصر آباد ہوں جن کی مادری زبانیں الگ الگ ہوں اور وہ

محض وحدت قومی کی خاطر کسی غیر مادری زبانیں کو قومی زبان بنانے پر متفق ہوگئے ہوں وہاں کسی خاص محاورے کی تقدیس پر بے جا اصرار اور روزمرہ محاورہ کے معاملے میں غیر مادری اُردو والے ادیبوں کی تحقیر، ملک کی لسانی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر منتج ہو سکتی ہے۔[6] وہ مزید لکھتے ہیں: ''پاکستان کے سب لوگ اہل زبان اور اہل اُردو ہیں اور ہم کسی کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کرتے جو یہ کہتا ہے کہ اُردو صرف ایک مخصوص گروہ کی ملکیت ہے۔'' [7] ان کے خیال میں: معیار کی درجہ بندی اس بنا پر ہو گی کہ اظہار وابلاغ میں کسی ادیب یا مصنف کا درجہ کیا ہے، بس یہی معیار ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ادب کے لیے زبان کی صحت پر اصرار کرنا لازم ہے، مگر اس کا انحصار بلاغت پر رکھا جائے۔ یعنی (ابلاغ معنی میں کامیاب تحریر صحیح بلکہ فصیح سمجھی جائے) محض پرانے اساتذہ یا اصطلاحِ عام میں اہلِ زبان کی سند پر نہیں۔[8]

زبان کے معیار کے تعین کے سلسلہ میں تجاویز

زبان کے معیار کے تعین کے سلسلہ میں انھوں نے درج ذیل تجاویز دیں :

(الف)۔ اُردو کے اساتذہ قدیم (کلاسیکی) اور فصحا کے محاورہ وروزمرہ کو زبان کے مرکزی مایہ خمیر کے طور پر آج بھی سند مانا جائے۔ آبادی کے وہ عناصر جن کی مادری زبان اُردو نہیں اس کلاسیکی کا اکتساب کریں اور اپنے اظہار وابلاغ کو اس کے مطابق ڈھالیں۔

(ب)۔ لیکن مادری اُردو عناصر، غیر مادری اُردو عناصر کی زبان کی تنقیص اور اپنے اظہار برتری کا رویہ ترک کر دیں اور نئے ماحول میں نئی اُردو کو صدق دل سے قبول کر لیں۔

(ج)۔ پاکستان میں اُردو کا ایک نیا لہجہ اور نیا روزمرہ پیدا کر رہے گا اس کے فطری عمل کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔

(د)۔ البتہ جبری عمل اور کمیٹی بازی کا طریقہ غیر فطری بھی ہے اور زبان میں انتشار پیدا کرنے کا موجب ثابت ہو گا۔ اس سے احتراز لازم ہے۔[9]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی اِسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا :

> زبان کسی خاص علاقے یا طبقے کی میراث نہیں ہوتی، جو لوگ اور جہاں کے لوگ اسے بولتے اور برتتے ہیں وہی اس زبان کے حقیقی وارث ومالک ہوا کرتے ہیں۔ اُدو کسی وقت لکھنؤ اور دلی کی زبان رہی ہو گی لیکن ہمیں اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ اب لکھنؤ یا دلی کی زبان نہیں رہی۔ اب وہ لاہور، کراچی، کوئٹہ، حیدرآباد، پشاور، پنڈی اور سرگودھا وغیرہ کی زبان ہے۔ یہیں کے لوگوں نے اسے اپنایا ہے، یہیں کے لوگ اسے بولتے اور برتتے ہیں۔ یہیں کے لوگوں کے ہاتھوں وہ آگے بڑھے گی اور یہیں کے لوگوں کے زیر اثر اس پر ایک نیا رنگ چڑھے گا، یہ رنگ علاقائی زبانوں اور علاقائی تہذیبوں کا ہو گا۔ یہی رنگ پختہ ہو کر اُردوئے معلی بنے گا اور اُردو کا مستند اسلوب کہلائے گا۔[10]

دورِ جدید میں زبان کی ترویج و اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ الیکٹرانک میڈیا ہے۔ اس لیے زبان کے معیار کے تعین میں اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ جدید دنیا میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت مسلم ہے اور ملکی وعالمی سطح پر زبان کے فروغ وترقی کا اہم ذریعہ ہیں۔ ذرائعِ ابلاغ سماج پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں اور زبان وتہذیب کے بنانے سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی زبان کی ترقی اور فروغ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا کردار مسلم رہا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن تعلیم کی اشاعت میں بھی حد درجہ

معاون ہیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تدریسی، زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے زرعی اور تعلیم بالغاں کے پروگرام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبار کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ٹیلی ویژن ہماری معاشرتی زندگی کا جزوِلازم بن چکا ہے۔ اندرون وبیرون ملک زبان وتہذیب کے فروغ میں ٹیلی ویژن کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر ہوا ماضی میں ریڈیو پاکستان زبان کے لیے معیار تھا اور ریڈیو کے صداکاروں کا تلفظ ولہجہ سند سمجھا جاتا تھا۔ ریڈیو پروگراموں کے پروڈیوسر اور دوسرے ذمہ دار افراد زبان وادب سے آگاہ ہوتے تھے اور رہنمائی کے لیے ماہرینِ زبان سے ہمہ وقت ان کا رابطہ رہتا، لیکن ٹیلی ویژن کے متعارف ہونے کے بعد صورتِ حال بتدریج بدلتی گئی اور یہ مسئلہ گھمبیر تر ہوتا گیا۔ اُردو کے نیوز کاسٹر، اینکر پرسن اور تبصرہ نگار اکثر غلط تلفظ ادا کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ٹیلی ویژن کے اربابِ بست وکشاد آخر اُردو کو کس سمت لے جارہے ہیں۔ اب تو یہ مشق اِس قدر بڑھ چکی ہے کہ صاحبانِ علم وادب چیخ پڑے ہیں اور گاہے گاہے رسائل واخبارات میں اِس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اُردو کی ہیئت بگاڑنے میں بھی ٹیلی ویژن کے مختلف چینل کا بھی بڑا کردار ہے۔ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں چاہے وہ ڈرامے ہوں، خبریں ہو یا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ، انگریزی اور اُردو کی ملغوبہ زبان (کھچڑی) استعمال ہورہی ہے جسے نہ اُردو کہا جاسکتا ہے نہ انگریزی۔ ٹیلی ویژن کے اُردو پروگراموں میں انگریزی الفاظ وفقرات کی بھرمار ایک نہایت غلط رجحان ہے۔ انگریزی الفاظ ہی نہیں بلکہ پورے پورے انگریزی جملے اس طرح بولے جاتے ہیں جیسے یہ پروگرام ذولساں (Bilingual) ناظرین کے لیے پیش کیے جارہے ہوں۔ حتیٰ کہ کھانے کے مشورے کے پروگرام میں بھی بیف، مٹن، چکن، انگریڈینٹ، سالٹ، چلی جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور زراعت کے مشوروں میں بھی Soil اور Seed کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ جب لہسن، پیاز، ٹماٹر، آلو، مرچ، ہلدی، نمک، دھنیا کے لیے انگریزی مترادفات استعمال ہوں گے تو نیم خواندہ خواتین کی خانہ داری کو کس درجہ چار چاند لگ جائیں گے اور اَن پڑھ کاشت کار زراعت کے مشوروں سے بھی جس حد تک مستفید ہوں گے، اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اُردو پروگراموں کے نام بھی انگریزی میں رکھے گئے ہیں۔ یہ رویہ خود اپنی زبان کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ مثلاً کیپیٹل ٹاک، ففٹی ففٹی، الیونتھ آور، آف دی ریکارڈ، اِن سیشن، پالیسی میٹر، بیوٹی کیئر، ہیلتھ فورم، گیسٹ آور، میڈ اِن پاکستان، خواجہ آن لائن، عالم آن لائن، مینا بازاز عائشہ ثنا، وغیرہ، اِسے لسانی تشدد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ لسنر، ویور، سٹارٹ، بریک، سٹیک ہولڈر، بریکنگ نیوز جیسی اصطلاحات عام ہیں حالانکہ اِن کے مقابل اردو کی خوبصورت اور عام فہم تراکیب موجود ہیں۔ ’’آدھا تیتر آدھا بٹیر کے مصداق یہ چلن اُردو کے ساتھ سنگین مذاق اور اِس کی تحقیر کا سبب ہے۔ معاشرے میں ایک متوازی اُردو پیدا ہورہی ہے، جس کا اثر بول چال پر بھی ہے اور تحریر وادب پر بھی۔۔ روزمرہ اور محاورے کے عدم استعمال سے اُردو کی فطری چاشنی ختم ہورہی ہے۔ ہے۔ انگریزی الفاظ اور جملوں کی بے جا آمیزش سے اُردو کا آہنگ اور حُسن مجروح ہورہا ہے اور اچھے اچھے سبک اور ٹکسالی الفاظ وکلمات کی جگہ غیر اردو الفاظ وکلمات کو راہ دی جارہی ہے۔ پرائیویٹ چینل اِس دوڑ میں پاکستان ٹیلی ویژن سے کو کہیں پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مصطفی کمال پاشا نے عربی رسم الخط پر پابندی عائد کرکے اپنی قوم کے لیے تمام تاریخی ورثے اور قرآن خوانی کے دروازے بند کر دیے تھے، اسی طرح ہمارا برقی میڈیا اُردو کا حلیہ بگاڑ کر نئی نسل کو زبان وتہذیب سے دور کررہا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مقتدر طبقے کے بچے انگریزی الفاظ کے لقمے کے بغیر ایک جملہ بھی نہیں بول سکتے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر پیش کیے

جانے والے پروگراموں میں شستہ اور درست اُردو کے استعمال کو فروغ دیا جائے اور اِس میں انگریزی کی بے جا اور بھونڈی آمیزش کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ معروف براڈ کاسٹر رضا علی عابدی کے بقول "میں زبان کے بارے میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اِس کا املا چھاپے خانے کے ہاتھوں بنتا اور بگڑتا ہے اور اِس کا تلفظ ریڈیو اور ٹیلی وژن ہی بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اُردو رسم الخط میں نہ ہندی جیسی ماترا کا رواج ہے، نہ قرآن جیسے زیر، زبر، پیش لگانے کا چلن ہے۔ جس طرح لفظ کانوں میں پڑتے ہیں، عام لوگ اِسی طرح ادا کرتے ہیں۔"[11] رضا علی عابدی نے ایک انٹرو میں اس قبیح روایت پر یوں شکایت کی: ٹیلی وژن اب میرے اعصاب پر ایک عذاب بن کر سوار ہے۔ پہلے ٹی وی پر ناظرین کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اب "ویورس" کہنا شروع کر دیا ہے۔ یہ لوگ زبان کے قاتل ہیں۔ ان کی گرفت ہونی چاہیے۔ اگر کوئی زبان کے ساتھ بد سلوکی کرے تو اس کو سزا ملنی چاہیے...جو پیش کار ہے اس کا ناظرین کی جگہ "ویورس" کہنا مجھے بہت کھٹکتا ہے۔ ناظرین کہنے میں کیا قباحت ہے۔ یہ کوئی نیا لفظ تو ہے نہیں، جب سے ٹیلی وژن شروع ہوا ہے "ناظرین" بولا جا رہا ہے۔ اُردو کے دانشوروں نے بھی اپنی گفتگو اور تحریروں میں انگریزی کا استعمال بڑھا دیا ہے۔ شاید اس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم نے مغربی ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اب تو ہندی الفاظ بھی آنے لگے ہیں۔ جو سوتے جاگتے ویڈیو پر ہندی گانے سنیں گے تو زبان تو بگڑے گی۔ یہ زبان کا زوال اور انحطاط ہے۔ زبان تقدس مانگتی ہے، احترام چاہتی ہے۔ زبان کوئی کھیل نہیں ہے۔[12]

املا کے معاملے میں غفلت زبان کے لیے ایک اور بڑا نقصان ہے۔ ٹیلی ویژن کے بعض ڈراموں کے عنوات اور متعلقات کے نام انگریزی رومن میں دکھائے جاتے ہیں۔ اِس منطق کی سمجھ نہیں آتی کہ اُردو رسم الخط میں لکھنے کی بجائے رومن میں لکھنے کا کیا جواز ہے۔ رومن میں لکھنا نہ اردو جاننے والوں کے لیے مفید ہے اور نہ غیر ملکیوں کے لیے۔ ہندوستان کا منظر نامہ بھی پاکستان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ وہاں ایک طرف اردو کو انگریزی متاثر کر رہی ہے اور دوسری طرف ہندی۔ جس کی ایک مثال دیتے ہوئے پروفیسر طاہرہ اقبال لکھتی ہیں: آج کل میں اپنے آٹھ سالہ بیٹے کے ہاتھوں بڑی تنگ ہوں۔ میں آواز دیتی ہوں "صہیب بیٹے! ذرا بات تو سنو"۔ جواب آتا ہے۔ "ماما! آپ نے تو میری شانتی بھنگ کر دی۔ آپ کا نالج 'تو شنے' ہے (یعنی You do not know) میں بھوجن نہیں کرتا۔ مجھے لگتا ہے میں نے صہیب کو نہیں کسی سوراج یا رام پرشاد کو آواز دی ہے۔" بیٹے اپنی زبان بولو لوگ کیا کہیں گے، ماں اُردو ادب کی پروفیسر اور بیٹا" ...ماما میرے سارے Friends speak like that اتیک بھاشا اراب یعنی out dated ہے۔ اپن تو ایسے ہی بولے گا۔ صہیب لڑکیوں کی طرح مٹکتا اور ہونٹ اور آنکھیں مٹکاتا کوئی دوسرا انڈین چینل بدلتا ہے۔[13] پروفیسر صاحبہ کے بقول: حد یہ کہ اَب بچے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے لگے ہیں اور لڑکیاں ہائے اللہ مر گئی کی بجائے "ہائے راما" کہہ کر مرتی ہیں اور یہ تو مدت ہوئی ہماری زبان سے خ غ اور ج وغیرہ ختم ہو چکے ہیں۔ اَب ہم کھوبصورت، کھش کھیال، گریب اور جرور وغیرہ بولتے ہیں۔ منگل سوتر پہنتے اور ساڑھی باندھتے ہیں۔ ساسوماں اور دیدی بولتے ہیں۔ یعنی ہماری زبان، لباس اور رشتوں تک اِن ڈراموں اور فلموں نے لپیٹ لیا ہے۔[14] یہ عمل صرف انڈیا تک ہی محدود نہیں بلکہ انگریزی کے اکثر مشہور کارٹون فلموں، کارٹون چینل، جغرافیائی چینل اور بچوں کی مختلف قسم کی فلموں اور ڈراموں کی سنسکرت آمیز ہندی ڈبنگ موجود ہے۔ جو پاکستان میں بھی آسانی سے دستیاب ہے۔ اگر زبان میں اخذ و قبول کا رجحان فطری اصول کے تحت انجام پائے تو زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن غیر فطری اصول اختیار کرنے سے زبان کا فطری حسن، مزاج اور تشخص مجروح ہوتے ہیں۔ میڈیا میں انگریزی کے الفاظ اور اصطلاحات کے ناگوار سے استعمال کے ساتھ

مختلف ٹیلی ویژن پروگراموں میں پاکستانی ثقافت اور اسلامی تہذیب کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جس طرح کا لباس اور طرزِ گفتگو دکھایا جاتا ہے، ہماری تہذیب وثقافت کی ہرگز نمائندگی نہیں کرتا، حتیٰ کہ بعض اوقات تو پاکستانی تہذیب کی تضحیک کی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود ڈرامے میں یہ جملہ سنا" وہ اُردو میڈیم قسم کی لڑکی ہے۔"جو زبان اعلانات، تقاریر، گفتگو اور مکالموں میں استعمال ہوتی ہے، انگریزی الفاظ کے بے جا استعمال سے اِس قدر بوجھل ہوتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اُردو میں اظہارِ مدعا سے عاجز ہیں۔ یہ مقامِ افسوس ہے کہ جن اداروں کو زبان کا محافظ ہونا چاہیے تھا، وہی اِس کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔ راقم کے خیال میں اِس کی دو وجوہات ہیں۔ اوّل: زبان پر دسترس نہ ہونے کی بنا پر انگریزی کے اُردو مترادفات کے استعمال میں دشواری ۔ دوم: حد سے بڑھا ہوا احساسِ کمتری، جس میں بحیثیت مجموعی پوری قوم مبتلا ہے۔ اگر زبان پر قدرت ہو اور لفظ کا محلِ استعمال درست ہو تو گفتگو میں وہ حسن پیدا ہوتا ہے جو اِس بے ڈھنگے پیوند سے نہیں ہو سکتا۔ بقول ڈاکٹر عطش درانی: اُردو کو انگریزی زدہ کرنے کا سب سے بڑا مجرم ہمارا ٹیلی ویژن ہے۔ جس ملک کی ۹۰٪ آبادی انگریزی کا ایک جملہ نہیں لکھ سکتی، اِس کے سامنے گفتگو اِس طرح کی پیش کی جاتی ہے۔ جس میں آدھے سے زیادہ الفاظ انگریزی کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ انگریزی کی موٹی موٹی اصطلاحات پیش کی جاتی ہیں۔۔۔ دراصل یہ اُردو کا عربی وفارسی سے رشتہ کاٹ کر اِسے سیکولر بنانے کی کوشش کا حصہ ہے۔[15]

بد قسمتی سے جس طرح بحیثیت مجموعی ہمارا معاشرہ تنزل کا شکار ہے اور ہم اپنی تہذیب وثقافت سے دور ہو رہے ہیں۔ اِسی طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے شعور ودانش اور علم وفہم کی گفتگو اور سنجیدہ پروگراموں کی بجائے پھکڑ پن اور بے ہودگی نظر آتی ہے ۔ میڈیا پر پیش ہونے والی چیز کو معیاری، مستند اور شائستہ ہونا چاہیے۔ غیر معیاری، لچر اور پوچ قسم کی گفتگو سے پوری قوم کے افراد پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ زبان صرف اظہارِ خیال کا ذریعہ نہیں، بلکہ تہذیب وتمدن اور ہمارے اخلاق کا بھی جزوِ لازم ہے۔ اُردو محض ایک جامع، سہل اور شائستہ وشیریں زبان نہیں بلکہ اِس کے پسِ منظر میں ہمارا قومی تشخص پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ غیر معیاری زبان صرف خیالات ہی کے لیے مضر نہیں بلکہ کردار کی کمزوری کا بھی باعث ہے۔ اس لیے میڈیا پر زبان وبیان کا درست اور مہذبانہ استعمال ہمارے اخلاق وکردار کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی رقم طراز ہیں : اُردو زبان صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک بھرپور تہذیب وثقافت کی نمائندہ زبان ہے۔ اگر زبان کے بگاڑ کا یہ سلسلہ اس طرح جاری رہتا ہے تو کیا ہماری آئندہ نسلیں اُردو زبان کے اصل چہرے کو پہچان پائیں گی اور اس زبان میں محفوظ اسلامی تہذیب وثقافت کے عظیم ذخیرے کو سمجھ پائیں گے ؟ لہٰذا اس مسئلے کی سنگینی کا نہ صرف ادراک بلکہ اس کا تدارک بھی کرنا چاہیے۔ اس مسئلے کو روز مرہ کے ایسے مشاہدے کے حوالے سے بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کوئی انگریزی دان، کوئی فارسی دان یا عربی دان اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت اگر کسی دیگر زبان کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور صرف اپنی زبان کی مدد سے ہی ابلاغ کے عمل کو مکمل سمجھتا ہے تو ایسی مشکل صرف اور صرف اُردو داں طبقے ہی کو کیوں محسوس ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ روش کا کیا نتیجہ نکلے گا؟[16]

اُردو صحافت

اُردو صحافت کی تاریخ بہت شاندار ہے۔ مولانا عبدالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک جیسے صاحبانِ علم خبر کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی پوری توجہ مرکوز رکھتے تھے اور خبر کے بیان میں زبان کی باریکیوں اور رموز سے آگاہ تھے۔ اس لیے اخبارات کا مطالعہ علمی وادبی تربیت کا ذریعہ ہوتا تھا۔ بقول سید اکرام الحق جاوید: سکولوں کے اساتذہ طلبہ کو غیر نصابی

سرگرمیوں کے طور پر اخبارات کا مطالعہ کرنے کی ہدایت کرتے تاکہ بچے کو نصابی کتب سے ہٹ کر بھی زبان وادب سے آشنائی ہوسکے اور پھر اُس دور کا ادب نواز طبقہ اخبارات کی اصطلاحات، جملوں کی بندش، الفاظ کے نئے اور استعمال کو بطور حوالہ بیان کرتا۔[17] اُردو اور انگریزی کے استعمال کی جائز حدود کا تعین ہونا چاہیے۔ مناسب، موثر اور موزوں انگریزی اصطلاحات کا استعمال برا نہیں۔ یہ ثروت مندی کی دلیل ہے، لیکن بلا ضرورت استعمال زبان کے لیے سمِ قاتل ہے اور صدیوں سے سنوری قومی زبان کے مزاج کو بگاڑنے کے مترادف ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے اخبارات بری طرح اس مرض کا شکار ہیں۔ جس سے اُردو زبان کے نہایت خوب صورت اور مروجہ الفاظ اور اصطلاحات متروک ہوتی نظر آرہی ہیں۔ مثلاً لیجسلیشن، اینٹی ڈمپنگ، امپورٹ ایکسپورٹ۔ اب ایک میٹرک پڑھا ہوا شخص اِس عبارت سے کیا سمجھ پائے گا۔ خبروں کے ساتھ ہمارے کالم نگار بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ آسان فہم اُردو میں لکھنے کی بجائے خواہ مخواہ اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ استعمال کرکے مرعوبیت اور ذہنی غلامی کا اظہار کرتے ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اُردو اخبارات کے کالم نگاروں اور ادارتی عملے کے لیے ورکشاپس اور ریفریشر کورسز منعقد کیے جائیں، جن میں بجائے انگریزی عام فہم اُردو الفاظ کے استعمال کی تربیت دی جائے۔ شہزاد علی / ڈاکٹر ممتاز کلیانی نے اس سلسلے میں چند تجاویز دی ہیں:

1- غیر معیاری زبان سے نجات پانے کے لیے ضروری ہے کہ صحافیوں کی تربیت کے لیے مختلف کار گاہ اور کورسز کا اہتمام کیا جائے۔

2۔ معیاری زبان کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اخبارات اس ضمن میں ضابطہ اخلاق کو لاگو کردیں۔

3۔ صحافیوں کے لیے ضروری ہے کہ تساہل اور کاہلی کو چھوڑ کر مطالعہ کی عادت اپنائیں اور اُردو لغت سے استفادہ کرنے کی صورت میں انگریزی الفاظ کے غیر ضروری استعمال سے چھٹکارا پائیں۔

4- قارئین کو یہ چاہیے کہ وہ ایسی تنظیمیں تشکیل دیں جو ایسے اخبارات سے بازپرس کرسکیں جو غیر معیاری زبان استعمال کرتے ہیں۔

خلاصۂ بحث

المختصر ضرورت اس امر کی ہے کہ صحافی آسان، عام فہم اور سادہ انداز تحریر کو اختیار کریں اور عامیانہ و بازاری پن سے احتراز کریں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ زبان کا بگاڑ قوموں کے بگاڑ پر منتج ہوتا۔[18] انھوں نے اُردو اخبارات میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے، جن کے متبادل اُردو میں موجود ہیں۔ مثلاً: لائن آف کنفلکٹ، پلان، مشن، کلیم، ریگولیشن، رسک، ریفرنس، گرین سگنل، فارمنگ، وارننگ، کمپرومائز، ڈکٹیٹر، کلین سویپ، ہارس ٹریڈنگ، مافیا، ویلکم، کراس بارڈر، ایکٹیویٹی، جائنٹ مانیٹرنگ، ویپن، ڈکلریشن، ہائی الرٹ، ویجی لنس، ڈومیننٹ وغیرہ۔ اِسی طرح مقامی زبانوں کے عامیانہ اور بازاری الفاظ مثلاً کھابے، چھترپریڈ، ڈبہ پیر، ٹُن، پلسیے، جیر ابلیڈ، پھڈا، وختہ، ڈکار لیے، اُڑن چھو، جگا، کھڈے لائن، سوٹے لگانا، بھونڈ، چھترول، لش پش، تتلیاں، ترتھلی، مک مکا، کھڑاک،، ٹوپی ڈرامہ، ہاں ہاں کرادی، منتیں ترلے وغیرہ جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اخباروں کی زبان کس قدر زوال پذیر ہے۔ الفاظ کے انتخاب کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ درست املا بھی ہے۔ موجودہ دور میں جرائد، رسائل اور اخبارات، غلط املا کو رواج دینے کا بھی بڑا ذریعہ ہیں۔ قارئین اُنھی ہجوں

کو اپناتے ہیں جو وہ اخبارات ورسائل میں پڑھتے ہیں۔ بدقسمتی سے اُردو میں کوئی معیاری صحافتی لغت دستیاب نہیں۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی نے اخباری زبان کی لغت کا منصوبہ بنایا تھا، جو بوجوہ پایۂ تکمیل نہ پہنچ سکا۔

اگرچہ اُردو ایک امتزاجی مزاج کی حامل زبان ہے اور اور ایک زندہ زبان کی طرح دوسری زبانوں سے اخذ و استفادہ اس کا بنیادی وصف ہے۔ جس طرح اِس نے ایک زمانے میں عربی وفارسی سے استفادہ کیا، اب انگریزی سے مستفید ہو رہی ہے۔ لیکن انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال زبان کی روح کو زخمی کر دیتا ہے۔ اُردو کے مقتدر اداروں کا فرض ہے کہ وہ اس اہم مسئلے کی اہمیت کا ادراک کریں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ہر دو کے لیے اردو زبان وادب کا میعار متعین کریں۔ زبان کے استحکام کے لیے لازم ہے کہ روزمرہ کی درستی، محاورے کی صحت، اظہار کی صفائی، بیان کی چستی، تلفظ کی درستی اور لہجے کی شائستگی کا خیال رکھا جائے۔ یہی عمل زبان کی بقا اور ترقی کا ضامن ہے۔

حوالہ جات

1 نصیر احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ساخت کے بنیادی عناصر (نئی دہلی: اُردو محل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء) ص ۲۹۔

2 مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر، نظامِ اُردو، بحوالہ لکھنؤ کی زبان، مصنفہ محمد باقر شمس (کراچی: دارالتصنیف، سن ندارد) ص ۳۔۲۔

3 سلیم عبد اللہ، اُردو کیسے پڑھائیں (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۷ء) ص ۱۱۱۔

4 سید عبد اللہ، ڈاکٹر، تحریک نفاذِ اُردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء) ص ۴۱۸۔

5 ابو محمد سحر، ڈاکٹر، اُردو رسم الخط اور املا (بھوپال: مکتبہ بھوپال، ۱۹۹۹ء) ص ۱۱۳۔

6 سید عبد اللہ، ڈاکٹر، تحریک نفاذِ اُردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء) ص ۴۲۰۔

7 ایضاً، ص ۴۳۵۔

8 ایضاً، ص ۴۳۲۔

9 ایضاً، ص ۴۲۲۔

10 فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، زبان اور اُردو زبان (کراچی: حلقہ نیاز و نگار، ۱۹۹۵ء) ص ۱۴۲۔

11 رضا علی عابدی، اُردو کا حال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء) ص ۱۳۹۔۱۴۰۔

12 رضا علی عابدی، جنگ مڈویک میگزین ۲۲ (کراچی: جنوری ۲۰۰۳ء) ص ۵۔

13 طاہرہ اقبال، پروفیسر، خوبصورت نہیں "کھوبصورت"، مطبوعہ اخبارِ اُردو (م اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، دسمبر ۲۰۰۴ء) ص ۱۹۔

14 ایضاً، ص ۱۹۔۲۰۔

15 عطش درانی، ڈاکٹر، پاکستانی اُردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء) ص ۶۱۔

16 نثار احمد قریشی، ڈاکٹر، اُردو میں انگریزی کی ملاوٹ، مطبوعہ اخبارِ اُردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، مارچ ۲۰۰۲ء) ص ۲۳۔

17 سید اکرام الحق جاوید، اخبارات میں اُردو تراکیب کا استعمال، مطبوعہ اخبارِ اُردو (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۸۹ء) ص ۱۷۔

18 شہزاد علی / ڈاکٹر ممتاز کلیانی، اُردو اخبارات میں مستعمل انگریزی وعلاقائی زبان کے لفظیات کے موزوں متبادل، مطبوعہ دریافت (اسلام آباد : نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، ستمبر ۲۰۰۴ء، شمارہ ۴) ص ۳۲۲۔